ڈاکٹر نذر خلیق

محسن خان پوری۔۔۔ایک ہمہ جہت شاعر

Mohsin Khanpuri was born in 1867 at Khanpur and died in 1944 at Bahawalnagar. He was a Yousafzai Pathan. His famous books are as "Khawab-e-Sar Shar", "Safar Nama London","Manavi Qahr-e-Ishque and Rangeeli Begum". The last book was the "Dewan-e-Rekhti". Mohsin Khanpuri was a famous poet of Rekhti. His first book Khawab-e- Sar Shar was published in 1906 from Sadhora India . He was a known poet of Rekhti in Pak-o-Hind but he said Ghazal also. Mohsin Khanpuri said Rekhties in a special style. We saw him a " Taraqui Passand Poet" also after readily "Khawab-e- Sar Shar".

محسن خان پوری کا اصل نام محسن خان اور تخلص محسنؔ تھا۔آپ 1867ء میں بہاول پور ڈویژن کے مشہور و معروف شہر خان پور میں پیدا ہوئے تاہم اپنی ذاتی ڈائری کے مطابق محسن خان پوری 1866ء میں بمقام بہاول پور میں پیدا ہوئے اور 6 جولائی 1944ء کو بہاول پور ڈویژن کے مشہور و معروف شہر بہاولنگر میں وفات پائی۔ اس وقت آپ اپنے فرزندِ ارجمند ماسٹر عبدالرحمٰن آزادؔ کے ساتھ قیام پذیر تھے جو اردو کے قادرالکلام شاعر بھی تھے۔آپ کا تعلق یوسف زئی پٹھان قبیلے سے تھا۔آپ اسٹیشن ماسٹر تھے۔آپ کا زیادہ تر وقت لکھنو، بریلی، امرتسر، انبالہ اور ساڈھورہ میں گزرا۔آپ نے لکھنو یت کا اثر قبول کیا۔خصوصاً لکھنو کی بیگماتی زبان، گھریلو بول چال، الفاظ و محاورں پر آپ کو عبور حاصل تھا۔آپ کی کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن میں ''ڈائی'' ''خوابِ سرشار'' ''سفر نامہ لندن، ہز ہائی نس نواب آف بہاول پور'' ''مثنوی قمر عشق عرف مہندی جان حنا'' ''ٹرانسوال واراور برجستہ پوئٹری'' وغیرہ معروف ہیں۔کہا جاتا ہے کہ آپ کی غزلوں کا ایک غیر مطبوعہ دیوان بھی تھا۔ وفات کے وقت آپ کے پاس موجود تھا لیکن افسوس کہ جب تک ان کے فرزندِ ارجمند ماسٹر عبدالرحمٰن آزادؔ زندہ رہے تو وہ محفوظ تھا لیکن اَب اس کا کوئی نشان یا سُراغ نہیں مل رہا اس کے علاوہ ان کی مشہور و معروف مثنوی قہرِ عشق کا ایک حِصہ جو غیر مطبوعہ تھا ملک کے مشہور شاعر حیدر قریشی کے پاس محفوظ ہے کیونکہ وہ مطالعے کے لیے لے گئے تھے جب کہ مثنو یکا دوسرا حصہ محفوظ نہیں ہے تاہم مصنف کے دعویٰ کے مطابق مثنوی کا دوسرا حصہ بہاول پور کے قدیم اخبار ''صادق الاخبار'' میں شائع ہو چکا ہے۔ایک پرانے اخبارات کی فائلوں سے اس کو تلاش کیا جا سکتا ہے۔اس سلسلے میں حیدر قریشی اپنے ایک مضمون ''اوراق گم گشتہ'' میں کہتے ہیں۔''محسن خان پوری (عنقا بیگم) کی جن دیگر رتصنیفات کا پتہ چلتا ہے۔اسن کے نام یہ ہیں۔''ڈائی'' ''خوابِ سرشار'' برہستہ پوئٹری وسفر نامہ لندن ہز ہائی نس نواب آف بہاول پور'' ''مثنوی قہرِ عشق'' جو بہاول پور کے پہلے ہائی سکول کے پہلے ہیڈ ماسٹر کے ایک طوائف سے معاشقے کی سچی کہانی ہے اس کے قلمی نسخے کا پہلا حصہ میرے پاس محفوظ ہے میں اس کے دوسرے

حصے کی تلاش میں ہوں اگر دوسرا حصہ ملک گیا تو ٹھیک وگرنہ ایک سو برس پہلے کے واقعات کا کھوج لگانے کے لیے ''صادق الاخبار'' (بہاول پور کا قدیم اخبار) کی پُرانی فائلیں تلاش کرنا پڑیں گیں کیونکہ مصنف کے دعویٰ کے مطابق ان واقعات کی تفصیلات ''صادق الاخبار'' میں بھی شائع ہوتی رہی ہیں۔

محسن خان پوری کی پہلی کتاب جو شائع ہوئی وہ غالباً ''ڈائی'' ہے یہ وہی کتاب ہے جس میں سرکار بہاول پور کی خدمت میں کسی نہیر کے اجراء کی تجویز پیش کی گئی تھی اور سرکار بہاول پور نے اس تجویز کو شرفِ قبولیت بخشا۔ ''ڈائی'' میں انگریزی اردو قصیدہ بادشاہ ایڈورڈ ہفتم اور عمدہ عمدہ ریختیاں بھی درج ہیں۔ ''ڈائی'' اس طرح ایک عمدہ کتاب تھی۔ ''مصنف خوابِ سرشار'' کے صفحہ نمبر ۳۲ پر ''ڈائی'' کے متعلق لکھتا ہے۔

> تعریف کی ضرورت نہیں یہ اپنی نظیر آپ ہے۔ یہ وہی کتاب ہے جس میں بذریعہ ایک دلچسپ کافی قصیدہ کے سرکار بہاول پور کی خدمت میں موجود نہر کے اجراء کی تجویز پیش کی گئی تھی اور جس کو فضل الٰہی سے شرفِ منظوری بھی حاصل ہو گیا اس کے علاوہ اس میں انگریزی اردو قصیدہ بادشاہ ایڈورڈ ہفتم اور عمدہ عمدہ ریختیاں بھی درج ہیں جس سے کتاب کا حسنِ ریپک پری یا ہو بہو گل صنوبر کی ڈالی نظر آتا ہے۔ یہ ''ڈالی'' سرکارِ عالی کی کاروبینش کی یادگار ہے۔ پہلے بلا قیمت تقسیم کی گئی تھی اب دو آنہ کے ٹکٹ بھیجنے پر روانہ ہو سکتی ہے۔ المشتہر خاکسار بابو محمد محسن خان مصنف دیوانِ ریختی خوابِ سرشار ''ڈائی'' ٹرالسوال وار وغیرہ اسٹیشن ماسٹر اودھ، روہیلکھنڈ ریلوے دبتورا اسٹیشن ضلع بدایون''۔ (۱)

''خوابِ سرشار'' میں صفحہ نمبر ۲۳ پر درج محسن خان پوری کے ان الفاظ سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ ''ڈائی'' خوابِ سرشار سے پہلے شائع ہوئی کیونکہ ''خوابِ سرشار'' میں یہ اقتباس درج ہے جب کہ ''خوابِ سرشار'' 1906ء میں بلالی سسٹم پریس ساڈھورہ ضلع انبالہ منشی محمد بلال کرم بخش کے اہتمام سے شائع ہوئی۔ خوابِ سرشار وہ کتاب ہے کہ جس میں شاعر محمد محسن خان نے بہاول پور کے عام سیاسی حالات برہم نظامِ زندگی کے بڑے دلیرانہ انداز میں عکاسی کی ہے۔ ملکی ترقی، خوشحالی، سرسبزی اور بہبودی اس کتاب کا موضوع ہے۔ یہ ایک طویل نظم ہے جس میں شاعر کے احساسات اور جذبات اپنے عروج پر ہیں۔ شاعر کتاب کے صفحہ نمبر ۳ پر کہتا ہے۔

> ''یہ گلدستہ بھی تر و تازہ پھولوں کی بہار خوشگوار کے نرالے اور انوکھے جوبن کے ساتھ پیش ہوتا ہے۔ پھول تو کیا معنی اگر انصاف کی نظر ایک پتی کے حسن پر بھی پڑ گئی یا ایک پنکھڑی سے بھی نگاہ عمیق بالتحقیق لڑ گئی تو باغبانِ بے نصیب کی تقدیر خصتہ بیدار ہو جائے گی۔ ساری مشقت، محنت، کلفت یک لخت بھول جائے گی ورنہ کیا مضائقہ ہے۔ (۲)

ے ایں ہم اندر عاشق بالائے غم ہائے دگر یہ گلدستہ ملکی ترقی اور یارانِ وطن کے آئندہ خوش حالی، سرسبزی اور بہبودی کے مضمون پر لکھا گیا ہے جس کا مصنف عاشق زار ہے اور جو اس کے حسنِ بیان کا اصل مطلب اور نظم کے ایک ایک لفظ سے روزِ روشن کی طرح جلوہ گر ہے وہ چاہتا ہے کہ انہی آنکھوں سے اپنے ملک میں ایک لوکل ریلوے، جس کی مالک خود ریاست ہو اور ایک نہر عظیم شراٹے کے ساتھ بہتی ہوئی دیکھ لے ان کے فوائد اور نتائج اس کے جانشینوں کو مبارک ہوں۔ بس انہی دو باتوں کی شاہی منظوری حاصل کرنے کے لیے اس نے اپنی عمر عزیز مضامین نگاری میں صرف کر دی اور اس دل آویز یا دل خوشکن مضمون کے حسنِ مطلب کو طرح طرح کی لبھانے والی اور موہنی صورتوں میں ادا کر کے پیش کرتا رہا۔ بابو محمد محسن خان اسٹیشن ماسٹر دبتورا ضلع بدایون''۔ (۳)

شاعر کے ان الفاظ سے بخوبی سمجھا جاسکتا ہے کہ شاعر ملکی یا ریاستی اصلاح واحوال سے کتنے مخلص تھے۔ شاعر نظم میں کہتے ہیں۔

''لکھنو میں ہے محلّہ جو امین آباد کا
آج کل اس میں فروکش خادمِ سرکار ہے
اس مقام دلرباپر اس خدائے قوم سے
تین دن میں دوستو! یہ نظم کی تیار ہے

ان اشعار سے یا نظم کے ابتدائی بند سے محسوس ہوتا ہے کہ شاعر ریاست کی حکومت کی خدمت میں کوشاں ہے اور قوم پرستی کے جذبے سے بھی سرشار ہے۔ ورنہ لکھنو میں رہنے والا شخص اپنے آبائی ریاست کے لیے اتنا بے چین نہیں ہوسکتا۔ درحقیقت محسن خان پوری اس دور میں زندہ تھے جب اکبرالہ آبادی کی حقیقت پسندی شاعری کا موضوع تھی آزاد، حالی اور سرسیّد کی اصلاحی تحریک کے اثرات بھی موجود تھے۔ اس لیے دوسرے شعراء کی طرح محسن خان پوری نے بھی ترقی پسندانہ اور حقیقت پسندانہ خیالات اپنی شاعری میں پیش کیے ہیں۔ حالانکہ اس دور میں ریاستی نظام کے بارے میں اس طرح کے خیالات پیش کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ شاعر اپنے خیالات اسی طرح پیش کرتے ہیں۔

؎ پوچھتے کیا ہو عزیز و خستہ حالوں کا وطن
مسکنِ صحرانوردان دشتِ پر از خار ہے

؎ جب کہ اے ابرِ کرم بحرِ کرم ہے جوش پر
سوائے تشنہء لب بیک قطرہ چرا انکار ہے

؎ مانا صاحب ساری دنیا ہے کرم سے شادماں
ایک کیوں مضموم ہے، محروم ہے، بیمار ہے

؎ ہے زمانہ بھر میں جاری چشمہ فیض و کرم
بند اِک شاعر یہ کیوں سرکار کا دربار ہے

؎ ہے یہی ساری حکایت کا میاں لبِ لباب
پیٹ بھرنے ہی سے جاتا بیٹ کا آزار ہے

؎ صف تو یہ ہے کہ جو ہے دشتِ قربت کا شکار
وہ یکے از کمترین بندہءِ سرکار ہے

؎ لاکھ ہیں اس فنڈ کے دو لاکھ ہیں، اس فنڈ کے
اور فکر فاقہ کش کچھ بھی نہیں زنہتار ہے

؎ ملک کا کچھ حالا شاہا واجب الاظہار ہے
خامہ سرگرم فضاں بادیدہ خونبار ہے

؎ دورے ہیں حد سے زیادہ مار ہے بیکار ہے
ذمہ دار اس فعل کا دربار ہے دربار ہے

؎ وم کی اصلاح پر مطلق نظر پڑتی نہیں
چشم حاسد سر بسر بردرھم و دینار ہے

؎ ظلم تو کرتے ہیں لیکن یہ نہیں دل میں خیال
پھونک دیتی بے کسوں کی آہ آتش بار ہے

''خوابِ سرشار'' کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ محسن خان پوری ترقی پسندانہ نظریات رکھتے تھے۔انہوں نے جس طرح اپنی شاعری میں ترقی پسندانہ نظریات کا اظہار کیا ہے اس سے یہ بات کہنے میں کوئی رکاوٹ نہیں رہتی کہ آپ کو ترقی پسند تحریک کے بانیوں میں شمار کیا جاسکتا ہے۔یادرہے کہ ''خوابِ سرشار'' کی اشاعت کے وقت ترقی پسند تحریک کا آغاز نہیں ہوا تھا۔ہاں البتہ اس طرح کے خیالات نظیر اکبرآبادی کے ہاں ضرور ملتے ہیں اور بعد میں علامہ اقبالؒ کے ہاں بھی اسی طرح کے خیالات ملتے ہیں تاہم فیض احمد فیض یا احمد ندیم قاسمی وغیرہ کی طرح کے ترقی پسند لوگ تو بہت بعد کی پیداوار ہیں۔احمد ندیم قاسمی 1916ء میں اس دنیا میں آئے جب کہ فیض احمد فیض 1911ء میں بلکہ ترقی پسند تحریک کے خدوخال تو 1936ء میں واضح ہوئے تاہم کتنے افسوس کی بات ہے کہ جو شاعر ایسے خیالات رکھتا ہو۔

؎ ہے یہی ساری حکایت کاعیاں لبِ لباب
پیٹ بھرنے ہی سے جاتا پیٹ کا آزار ہے
؎ حیف تو یہ ہے کہ جو ہے دشتِ قربت کاشکار
وہ یکے از کمترین بندہءِ سرکار ہے
؎ ایسا بگڑا کارخانہءِ عالم ایجاد کا
ایک ہے سرشار دولت ایک پر ادبار ہے
؎ لاکھ ہیں اس فنڈ کے دو لاکھ ہیں اس فنڈ کے
اور فکر فاقہ کش کچھ بھی نہیں زنہار ہے

اس طرح کے خیالات رکھنے والا شاعر اگر محققین کی نظر سے نکل جائے تو کتنے افسوس کی بات ہے بلکہ میں تو کہتا ہوں خہ وہ محقق ہی نہیں جو ترقی پسند تحریک کا احوال لکھتے ہوئے محسن خان پوری کو نظر انداز کر دے۔اس شعر کو دیکھئے اور پھر بتایئے کہ ترقی پسند تحریک کے ضمن میں ایسے شاعر کو نظر انداز کیا جاسکتا ہے۔

؎ ملتی کیوں اجرت نہیں کچھ اس مشقت کے لیے
جس کو لیتا مفت میں سرکاری اہل کار ہے

''خوابِ سرشار'' میں قصیدوں اور نظموں میں فکر کے ساتھ ساتھ فن پر بھی زور دیا گیا ہے سب سے بڑی خوبی ایک ہی ردیف کا استعمال ہے۔یہ طریقہءِ کار ان کی علمیت اور شاعرانہ زورِ بیان کو ظاہر کرتا ہے۔اس میں ہلکے پھلکے انداز بلکہ زیادہ مزاحیہ انداز میں بہاول پور کی اقتصادی اور سیاسی حالت کو نمایاں کیا گیا ہے جب کوئی بھی فنکار سماجی حوالے سے بات کرتا ہے تو ترقی پسند نظریات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔محسن خان پوری بھی اسی طرح کا شکار ہیں۔نظیر اکبرآبادی کے بعد محسن خان پوری وہ واحد شاعر ہیں جن کا موقف واضح طور پر ترقی پسندانہ ہے اگرچہ زمانے نے ان کی شاعری پر دبیز پردے ڈال دیئے ہیں لیکن پھر بھی ان پردوں کی باریک لکیروں میں سے نکلی ہوئی روشنی دل کو لبھاتی ہے۔

مختصر ہم اگر محسن خان پوری کی تصانیف کے حوالے سے خصوصاً ''ڈالی'' اور ''خوابِ سرشار'' کے حوالے سے دیکھیں تو وہ ایک ترقی پسند شاعر کے طور پر بھی ہمارے سامنے ابھرتے ہی بلکہ نظیر اکبرآبادی کے بعد ان کا مرتبہ ہے۔انہوں نے شعوری طور پر افلاس اور دولت مندی کے اس فرق کو محسوس کیا جو انسان میں تفریق پیدا کرتا ہے۔ریاستی ظلم وستم اور معیشت کو بھی محسوس کیا۔ماجد قریشی اپنی کتاب ''دبستانِ بہاول پور میں کہتے ہیں۔

''انہوں نے شعوری طور پر غربت اور امارت کے فرق کو محسوس کیا ریاستی ماحول کے ظلم وستم اور بیگار کو دربار کی ذمہ داری قرار دیا۔ معاشی حالات کی ابتری کے لیے خود مختاری آمریت کو ذمہ دار ٹھہرایا۔ محسن کے ہاں یہ رنگ انفرادیت سے نکل کر اجتماعیت کے سانچوں میں ڈھل گیا ہے اور ان کی شاعری عوام کے دکھ درد کی پکار بن گئی ہے۔''(۴)

محسن خان پوری ریختی کے بھی بہت بڑے شاعر تھے اور عنقا بیگم تخلص کرتے تھے۔ محسن خان پوری وہ واحد شاعر ہیں جنہوں نے ریختی میں بھی اپنا ایک نیا اور اچھوتا انداز اختیار کیا۔ حالانکہ ان سے پہلے ریختی کی روایت کچھ اور تھی۔ محسن خان پوری کا دیوان ''دیوانِ ریختی'' عرف رنگیلی بیگم پہلی مرتبہ 1921ء میں لکھنو کے گلزار ابراہیمی پریس سے شائع ہوا اور ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو گیا جب کہ دوسری مرتبہ بعض روایتوں کے مطابق 1936ء میں اور بعض کے مطابق 1940ء میں لکھنو کے پریس نولکشور سے طبع ہوا۔

دیوانِ ریختی پر اظہار خیال سے پہلے ضروری محسوس ہوتا ہے کہ یہ دیکھ لیا جائے کہ ریختی کیا چیز ہے؟ اور اس سے بیشتر یہ بھی دیکھا جائے کہ ریختی کا آغاز کیسے ہوا؟ درحقیقت دہلی کی بربادی کے بعد شعرا کرام نے لکھنو کو اپنا مرکز بنایا۔ لکھنو پر سکون جگہ تھی جہاں مالک و دولت کی فراوانی اور ہر طرح کی بے فکری تھی۔ چنانچہ وہاں شعراء کرام نے اپنی شاعری کا رُخ تبدیل کر لیا یا یوں کہہ لیجیئے کہ لکھنو میں خوشحالی، ہر طرح کی بے فکری میں عیش کوشی اور لذت پسندی کی جو فضا قائم تھی اس کا اثر شعراء کرام کی شاعری پر بھی پڑا۔ اہل علم یہ بھی جانتے ہیں کہ لکھنو میں طوائف کو مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ یہاں تک کہ طوائف وہ مرکز تھی جہاں نواب سے لے کر شاعر تک حاضر ہوتے۔ اس عالم میں عورت کو اہمیت حاصل ہوئی۔ عورت کی طرف سے اظہارِ محبت کا رُجحان پیدا ہوا۔ اس رُجحان کی وجہ سے شاعروں کے ہاں ریختی کی صنف پیدا ہوئی۔ ریختی عورتوں کی طرف سے عورتوں کی زبان میں اظہارِ محبت کا نام ہے۔ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار اپنے ایک مضمون ''دبستانِ لکھنو'' میں کہتے ہیں۔

''لکھنو میں جس صنف نے زیادہ شہرت پائی وہ ریختی ہے جو ریختہ کی رعایت سے تانیث کا درجہ رکھتی ہے۔ اس میں عورتوں کے جذبات و احساسات انہی کی زبان میں ادا کئے گئے۔ ہر چند کہ عورتوں کا اظہارِ محبت کرنا کوئی نئی بات نہ تھی۔ ہندی شاعری میں بھی اس کا رواج ملتا ہے اور اردو کی دکنی شاعری میں بھی لیکن ریختی خالصتاً لکھنوی ماحول کی پیداوار ہے اس کے موجد بقول انشاء سعادت یار خان رنگین تھے۔ انشاء نے خوب بھی ریختی میں دیوان لکھا ہے۔ ریختی کے فن میں رنگین کے بعد جان صاحب نے بڑا نام پیدا کیا اور اگر چہ ان کے بعد بھی ریختی کے شعراء پیدا ہوئے لیکن ان پر ریختی کے کمال و فن کا شہرہ ختم ہو گیا۔ ریختی کا فن باوجود غیر مہذب ہونے کے اپنے دامن میں دلچسپی کے پہلو بھی لئے ہوئے ہے اردو شاعروں نے عورتوں کی زبان میں لکھنوی تہذیب و معاشرت کے بہت سے پہلوؤں کو نمایاں کر دیا ہے۔ اعلیٰ و ادنیٰ طبقے کی عورتوں کو جو جو معاملات پیش آتے ہیں محبت، لگاؤ، ہجر، وصال، حسد اور رقابت کے سلسلے میں اور زیوارت کے نام وغیرہ ریختی کے ذریعے معلوم ہو جاتے ہیں۔ جان صاحب کے دیوانِ ریختی میں ایک مخمس ''شہر آشوب'' بھی مل جاتا ہے جس میں انہوں نے بیگماتی زبان میں لکھنوی زندگی کے بعض پہلوؤں مثلاً معاشی حالت، بعض طبقوں میں دولت کی فراوانی اور بعض میں غربت و افلاس کی حکمرانی، اعمال حکومت کی بدانتظامی، رشوت خوری، عدل و انصاف کے فقدان، مختلف طبقات کی معاشرتی و خانگی زندگی کو بیان کرتے ہوئے مرزا رفیع سودا تتبع میں بعض پیشہ وروں کے ہجو بھی کہی ہے اور اندھی نگری، راجا چوپٹ، شہر میں ہڑ بونگ کا تذکرہ کرتے ہوئے ایک بند میں بادشاہِ وقت کی مدح اور ایک میں سچی بات کہنے پر احتساب کے خطرے کا اظہار کیا ہے۔

اسی طرح ریختی میں اور بھی چند ایک کارآمد باتیں مل جاتی ہیں۔علیٰ الخصوص لکھنو کی بیگماتی زبان اور محاورے جو ریختی کی بدولت ہم تک پہنچے لیکن بقول عبدالحلیم شرر ''ریختی'' میں اگر فحش اور بدکاری کے مذاق سے پرہیز کر کے پاک دامنی کے جذبات اختیار کیے جاتے تو یہ فن ایک حد تک قابلِ ترقی ہوتا مگر خرابی یہ ہوئی کہ اس کی دنیا بدکاری کے جذبات اور بے عصمتی کے خیالات پر تھی اس لیے ریختی گویوں کا قدم ہمیشہ جادہ تہذیب و اعتدال سے باہر ہو گیا اور اس سے زبان کو چاہیے کسی حد تک فائدہ ہوا مگر اخلاق کو نقصان پہنچا۔'' (۵)

جب کہ ڈاکٹر سلیم اختر کہتے ہیں کہ ریختی کے پہلے شاعر رنگین کی بجائے قیص حیدرآبادی ہیں۔ جو نہ صرف انتیس برس پہلے کے شاعر تھے بلکہ اُنتیس برس پہلے ان کا ریختی کا دیوان بھی شائع ہو چکا تھا۔ رنگین نے اپنے ریختی کے دیوان ''انگجتہ'' میں خود اپنے آپ کو ریختی کا موجد ہونے کا دعویٰ کیا ہے حالانکہ یہ غلط ہے۔ابتدائی ریختی گویوں کے چند اشعار مندرجہ ذیل ہیں۔

؎ جس کی چڑیا کا یہ عالم تھا کہ اب اڑ جائے
میں نے باجی سے جو کل شرط میں ہاری انگیا

(قیص حیدرآبادیؔ)

؎ کل جو مغلانی نے سی دے کے مروڑی انگیا
ہو گئی تنگ بچھاون سے نگوڑی انگیا

(سعادت یار قادر رنگینؔ)

؎ چھپ چھپا کر تو کسی ڈھب سے بلا کے گھر میں
تیکھا بانکا سا کھڑا ہے وہ خنجر والا

(گلاب چند سمنؔ)

؎ جو دیکھتا ہے سر کو پتھر پہ مارتا ہے
ہونٹوں کی تیری لالی اور میری بھولی بھالی

(سیّد امام علی بالگرامیؔ)

؎ نہیں نازنین رنج کرتی کسی کا
گیا جب سے یار اور حرمت ہے کھوئی

(علی بیگ نازنینؔ)

؎ ہوئی عشاق میں مشہور یوسف سا جواں تاکا
بواہم عورتوں میں تھا بڑا دیدہء زلیخاں کا

(مہر یار علی خانؔ)

؎ عجب بلا میں پھنسی ہوں گویاں میں اس نگوڑے سے دل لگا کر
یہ دونوں پھوٹیں جو رات سوئی پھول میں پلک سے پلک لگا کر

(عابد مرزا بیگمؔ)

؎ ریل لے بھاگی میاں کو اور بی بی چھٹ گئیں
پہنچا ابرا لکھنو دلی میں استر رہ گیا

(نثار حسین خدشیدا)

ریختی کے اس ارتقاء میں محمد محسن خان محسن کا بھی بڑا کام ہے کیونکہ انہوں نے لکھنو اور دلی کی زبان کو جس طرح اپنے دیوان میں استعمال کیا ہے۔ بیگماتی زبان، خواتیں کی گھریلو زبان اور محاوروں کو شاعری کا جامہ پہنایا ہے۔ شاید ہی کوئی مانے پر تیار ہوگا کہ وہ سرزمین بہاول پور کے ایک چھوٹے سے قصبے خان پور کا باشندہ تھا حیات میرٹھی اپنی کتاب نقوش رفتگاں میں لکھتے ہیں۔

''تعجب خیز یہ امر ہے کہ سرزمین بہاول پور کے ایک شاعر میں ریختی کو اپنا کر یہ ثابت کر دیا ہے کہ وہ اس فن میں اہلِ زبان ہونے کے دعویدار سے کسی صورت پیچھے نہیں ہیں۔ محسن کے دیوان ریختی عرف رنگیلی بیگم کا مطالعہ کرنے کے بعد ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کا مصنف کوئی ایسا شخص ہے جو لکھنو اور دِلی کی عورتوں کی گھریلوں چال سے پوری طرح باخبر ہی نہیں بلکہ جن الفاظ اور محاوروں کا اس دیوان میں استعمال کیا گیا ہے وہ اس کی اپنی روزمرہ کی زبان میں شامل ہیں۔ محسن خان پوری کی ریختی شاعری بلاشبہ فحش الفاظ اور کھلی ہوئی گالیوں سے بڑی حد تک پاک ہے۔ اس میں چند ایک الفاظ ایسے ہیں جو ناشائستہ ہیں جن کا مصنف نے خود اعتراف کیا ہے۔''(۶)

حیات میرٹھی کے اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ محسن خانپوری نے ریختی کا جو نمونہ اپنے دیوان میں پیش کیا ہے وہ عبدالحلیم شرر کی خواہش کی عکاسی کرتا ہے جس کا اظہار انہوں نے اپنی کتاب ''مشرقی تمدن کا آخری نمونہ ۔ گزشتہ لکھنو'' کے صفحہ نمبر ۱۸۰ پر کیا ہے۔ وہ کہتے تھے کہ ریختی میں فحش اور بدکاری کے مضامین نہیں ہونی چاہییں۔ جادہ تہذیب واعتدال کو اختیار کرنا چاہیے۔ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ عبدالحلیم شرر کے اس خیال اور خواہش پر ہی محسن خان پوری نے اپنی ریختی میں شائستگی پیدا کی تاہم یہ کہا بھی جا سکتا ہے کیونکہ عبدالحلیم شرر اور محسن خان پوری کا دور ایک ہے۔ اس کے علاوہ عبدالحلیم شرر لکھنو میں اسی ادارے سے وابستہ رہے ہیں جس ادارے نے محسن خان پوری کا دیوان رنگیلی بیگم دو مرتبہ شائع کیا تاہم یہ حقیقت اپنی جگہ ہے کہ محسن خان پوری کی ریختی کی شاعری قطعاً مختلف ہے جس کا اظہار انہوں نے خود اپنی کتاب رنگیلی بیگم کے دیوان میں کیا ہے۔

''آج تمام ہندوستان کے کتب خانوں اور کتب فروشوں کی دکان پر ایک ایسی بھی کتاب نظر نہیں آتی جس کا نام دیوان ریختی ہو۔ جس کی دید سے حسنانِ دہلی اور لکھنو کی پیاری پیاری، لبھانے والی بول چال، شوخی، مذاق، رمز، کنایہ اور شرارت بھری چتون کی ہو بہو تصوری ہمارے آنکھوں کے سامنے کھچ جائے۔ ان کے لیے رنج اور خوشی ظاہر کرنے والے خیالات کی انوکھی اور بانکی اداؤں کا جلوہ نظر آئے جس میں شوخی اور دلبر بائی کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی ہے(۷)۔

جو کچھ ہم پیش کرتے ہیں وہ ایسی معمولی اور سیدھی سادی باتیں ہیں جو تقریباً ہر روز اور ہر کہیں ہمارے سامنے واقع ہوتی رہتی ہیں۔ ہمارے کان ان کیفیتوں سے باخوبی آشنا ہیں۔ یہی دیوان ہذا کی اصلی پالیسی ہے جس کا ثبوت کلام خود پیش کر رہا ہے۔ کیونکہ ہم نے اپنے دیوان میں نو ایجاد پھول پیش کرنے کا وعدہ کیا ہے۔ جو موجودہ زمانے کی ترقی نے شاید ہماری ہی قسمت میں لکھ رکھتے تھے۔ لہذا ہمارے اور جان صاحب کے کلام میں اس قدر اختلاف ہے جو ہوا اور پانی، خاک اور آتش یا دن اور رات میں جو بات اس میں ہے اس میں کوسوں پتہ نہیں اور جو اس میں ہے اُس میں مطلق ندارد۔ ان کے کلام میں فحش یا ننگی گالیاں لبالب بھری ہیں۔ اس کے برعکس ہمارے کلام میں چمن ان کانٹوں سے بالکل پاک ہے۔ دوسری بات جو بالکل برعکس، پیچیدہ اور چونکا دینے والی یہ ہے کہ جان صاحب کے دیوان میں اس کے برخلاف ہمارے

دیوان میں اس کی وہ بھرمار ہے کہ جس کا شمار نہیں ہے۔(۸)''

ایک اور فرق یوں لکھتے ہیں۔

جان صاحب مرحوم اپنے سامعین کو خوش کرنے کے لیے ایک من گھڑت فحش مضمون دِل سے ایجاد کرلیا کرتے تھے جس کو واقعات سے کچھ سروکار نہ ہوتا تھا۔اس کے برخلاف راقم نے جو کچھ لکھا ہے وہ سب واقعات کی تصویر اور مشاہدات کا ذاتی فوٹو ہے یا لکھنو کے ان رنگین جلسوں کی کیفیت ہے جن میں سالہا سال تک متواتر مصنف کو شامل ہونے کا اتفاق ہوتا رہا۔''(۹)

محسن خان پوری کے ان الفاظ سے ہم بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ وہ ریختی کی صنف میں بھی ایک نئی اور انوکھی تبدیلی کے موجد ہیں۔حالانکہ ریختی کا آغاز اور جان صاحب تک تمام ریختی گویوں نے ریختی میں فحش مضامین اور ابتذال کو بیان کیا ہے تاہم محسن خان پوری بھی چند الفاظ ایسے اپنے دیوان میں استعمال کر گئے ہیں جو ناشائستہ الفاظ ہیں اور اس کا اعتراف انہوں نے صفحہ نمبر ۸ پر کیا ہے، کہتے ہیں۔

''کسی رنڈی، چھنال، مال زاری، بھڑوا، دھگڑا، ننگا، اٹھائی گیر وغیرہ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ ناشائستہ الفاظ ہیں مگر اشتعال طبع کے وقت بڑی سے بڑی مہذب اور شائستہ بیگمات اور شہزادیوں کی زبان سے بھی نکل جاتے ہیں جن سے اصحاب سخن شیخ اور حضراتِ معاملہ فہم بخوبی آشنا ہیں۔ہم ان سے نقل کرنے سے اس قدر خطاوار نہیں ٹھہرا سکتے جس قدر ان کے بولنے والے گنہگار ہیں۔ہم ان بزرگوں سے معافی مانگتے ہیں جو ان کے مخالف ہوں اور جنہیں ایسے الفاظ سننے کا اتفاق نہ ہوا ہو۔''(۱۰)

دیوان ریختی کے مطالعے سے محسوس ہوتا ہے کہ شاعر کو لکھنو کے ماحول اور اس دور کی تہذیب سے خاصا لگاؤ تھا یہی وجہ ہے کہ دیوانِ ریختی کے مطالعے سے آج سے لگ بھگ پون صدی پہلے کی لکھنو تہذیب، زبان اور شعری رویوں کا اندازہ ہوتا ہے۔حیدر قریشی اپنے مضمون 'اوراقِ گم گشتہ' میں لکھتے ہیں۔

''میرے نزدیک ان کی اہمیت اس لیے بھی زیادہ ہے کہ آج سے لگ بھگ پون صدی پہلے کے ایک سرائیکی نے اردو زبان لکھنو میں رائج الوقت، روزمرہ محاورہ اور شعری رویوں کو اس طرح برتا کہ اہلِ زبان اور غیر اہلِ زبان کا فرق ہی نہ رہنے دیا یہ اس دور کی بات ہے جب ساری ریاست بہاول پور میں دو جماعتیں پاس کر لینے والے کو پڑھا لکھا سمجھا جاتا تھا اور سارا شہر ایسے شخص سے اپنے خطوط لکھانے، پڑھانے کا کام لیا کرتا تھا اور ایسے پڑھے لکھوں کی تعداد بھی انگلیوں پر گنی جا سکتی تھی۔''(۱۱)

دیوان ریختی کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر نہ صرف صنفِ ریختی میں اچھوتے انداز کے موجد ہیں بلکہ زبان و بیان کے تمام تقاضوں سے بھی آگاہ ہیں زبان کی سادگی کا یہ عالم ہے کہ سو سال کے قریب کے پہلے کی اردو بھی آج کی اردو معلوم ہوتی ہے۔محمد عبداللہ قریشی ''نقوش'' کے طنز و مزاح نمبر کے صفحہ ۷ پر کہتے ہیں۔

''محسن وعنقا خان پور کے ایک شاعر محسن خان کے تخلص تھے جو ریختی گو تھے اور عرصہ تک لکھنو میں باسلسلہ ملازمت مقیم رہے ان کے کلام میں دہلی اور لکھنو دونوں جگہ کی زبانوں کے لطف کے ساتھ سماج پر طنز، شوخی، شرارت، رمز، کنایہ، سب کچھ موجود ہے۔خیالات انوکھے اور طرز بیان میں جدت ہے۔(۱۲)

محسن خان پوری صرف ریختی ہی کے شاعر نہیں تھے بلکہ انہوں نے غزلیں بھی کہی ہیں۔یہ الگ بات ہے کہ ان کا دیوان جو غزلوں پر مشتمل تھا شائع نہ ہو سکا۔زمانے کی ستم ظریفوں کی نظر ہو گیا۔غزل میں تغزل مضمون آفرینی، معاملہ بندی اور حسن ادا، ایمائیت موجود ہے۔غزل پر زیادہ سے زیادہ اظہار خیال اس لیے بھی نہیں کیا جا سکتا ہے کہ ہمیں ان کی چند غزلیں نہیں

دستیاب ہوئی ہیں۔ جو دیوانِ ریختی کے آخر میں دی ہوئی ہیں تاہم اتنا ضرور محسوس ہوتا ہے کہ وہ غزل میں بھی کسی سے پیچھے نہیں تھے یہاں تک کہ انہوں نے اپنی شاعری کا آغاز بھی غزل ہی سے کیا تھا۔ان کی پہلی غزل ۳۱ مئی ۱۸۸۳ء کو بہاول پور کے صادق الاخبار میں شائع ہوئی۔اس وقت آپ سترہ سال کے تھے اور ابھی طالب علم تھے اس غزل کے سات مشہور ومعروف ایڈیٹر حافظ عبدالقدوس قدسی جو کہ خود بھی بہت بڑے شاعر تھے کا ایک نوٹ بھی شائع ہوا۔اس نوٹ کی عبارت کچھ یوں تھی۔

''سخن گوئی کا وقت ابھی بہت ہے۔زمانہ طالب علمی میں بجز تحصیل علم اور کوئی شغل اچھا نہیں۔''

محسن خان پوری کا ابتدائی دور اور پھر آخری دور جب وہ ملازمت سے ریٹائر ہوکر ۱۹۲۵ء میں بہاول پور واپس آئے غزل کا دور ہے اور ان کی غزل اس دور کے بڑے سے بڑے غزل گو سے زیادہ بھاری نہیں تو کم بھی نہیں۔ویسے تو محسن خان پوری کا فکر وفن کے حوالے سے جائزہ لیں تو شاید کئی کتابیں لکھنا پڑیں کیونکہ انہوں نے غزل،مثنوی،طویل نظم،ریختی اور منظوم سفر نامہ بھی لکھا تاہم دستیاب مواد کی روشنی میں محسن خان پوری اپنے دور کے بہت بڑے ریختی گو،مثنوی نگار،غزل گو اور ترقی پسند شاعر تھے اور ہیں۔یہ الگ بات ہے کہ اردو ادب کے نقاد اس عظیم شاعر سے بے خبر ہیں اور اردو ادب کی تاریخ لکھنے والے بھی نا آشنا ہیں جو بڑے بڑے شہروں میں بیٹھے اپنے اردگرد کے لوگوں کے بارے میں لکھ کر یا پرانی کتابوں کو کھنگال کر تاریخ دان بن بیٹھے ہیں۔میں یہاں محسن خان پوری کی ریختی کا نمونہ اور غزل کا نمونہ درج کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

حوالہ جات

۱۔ خوابِ سرشار بابو محمد محسن خان محسن ہلالی سٹیم پریس ساڈھورہ ضلع انبالہ
۲۔ رنگیلی بیگم محمد محسن خان محسن نولکشور پریس لکھنو
۳۔ دبستانِ بہاول پور ماجد قریشی ادارہ مطبوعاتِ آفتاب مشرق بہاول پور
۴۔ نقوشِ رفتگاں حیات میرٹھی ادارہ مطبوعات آفتاب مشرق بہاول پور
۵۔ بہاول پور میں اردو مسعود حسن شہاب دہلوی اردو اکیڈمی بہاول پور
۶۔ ماہنامہ نقوش طنز ومزاح نمبر محمد طفیل ادارہ نقوش لاہور
۷۔ اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ ڈاکٹر سلیم اختر سنگِ میل پبلیکیشنز اردو بازار لاہور
۸۔ مختصر تاریخ ادب اردو اصغر حسین خان نظیر لدھیانوی عشرت پبلشنگ ہاؤس ہسپتال روڈ انارکلی لاہور
۹۔ تاریخ ریختیت سیّد محمد نقوی
۱۰۔ ۔دریائے لطافت سیّد انشاء اللہ خان انشاء انجمن ترقی اردو لاہور
۱۱۔ مشرقی تمدن کا آخری نمونہ گزشتہ لکھنو۔عبدالحلیم شرر
۱۲۔ لکھنو کا دبستانِ شاعری ڈاکٹر بوالليث صدیقی

مضامین

۱۔ دبستان لکھنو ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار مطبوعہ ماہنامہ ادب لطیف لاہور
۲۔ اوراق گم گشتہ حیدر قریشی مطبوعہ جدید پبلیکیشنز ضلع رحیم یار خان